اہل سنت اور روافض کے مابین دو متنازعہ مسائل پر مفصل فتوے

باغِ فدک

مع

حدیثِ قرطاس

مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ

تحریکِ فکرِ رضا انٹرنیشنل

اہل سنت اور روافض کے مابین دو متنازعہ مسائل پر مفصل فتوے

مفتی جلال الدین احمد امجدی

تحریکِ فکرِ رضا، ایونڈ

نام کتاب .... باغ فدک مع حدیث قرطاس

مؤلف .... مفتی جلال الدین احمد امجدی

اشاعت 2014

قیمت 50

تحریک فکر رضا انڈیا

فہرست

اِبتدائیہ

فقیہِ دین وملت، محقق اہل سنت حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی دُنیا میں کئی طرق سے شہرت عطا فرمائی ہے:۔

- آپ رئیس القلم حضرت علامہ محمد ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ رشید اور صدر الشریعہ مولانا محمد امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید صادق ہیں۔
- آپ اہل سنت و جماعت کے معروف عالم، جید مفتی، معتبر محقق اور مصنفِ کثیر الکتب ہیں۔
- آپ کی کتابیں ''انوارُ الحدیث''، ''اِسلامی تعلیم''، ''تعلیم الاسلام'' اور ''انوارِ شریعت'' عرصۂ طویل سے اکثر مدارسِ اِسلامیہ کے نصاب میں شامل ہیں۔
- آپ کے مجموعہ ہائے فتاویٰ ''فتاویٰ فیض الرسول'' اور ''فتاویٰ فقیہ ملت'' کو اہل علم کے ہاں غیر معمولی قبولیت واہمیت حاصل ہے۔
- نہ صرف علماء وطلبا بلکہ عوام المسلمین میں بھی آپ کی تصانیف کو مقبولیت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔
- دینی و علمی حلقوں میں آپ کو ایک مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

و ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء و الله ذو الفضل العظيم۔

زیرِ نظر رسالہ دراصل ''فتاویٰ فیض الرسول'' کے دو مفصل ومطول فتاویٰ کا مجموعہ

ہے، جو کہ ایک مستقل رسالے کی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے متعلق حضرت فقیہ ملت کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا عبدالمُبین نعمانی مدظلہ رقم طراز ہیں:

''**مسئلہ باغِ فدک**: اہل سنت اور روافض کے درمیان ہمیشہ سے موضوعِ بحث اور معرکہ آرا رہا ہے۔ حضرت فقیہ ملت دامت برکاتہم نے اس موضوع پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور عقلی و نقلی دلائل کا انبار لگا دیا ہے، جس سے حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شخصیت بالکل بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے اور شکوک و شبہات کے سارے تار و پود بکھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ طویل فتویٰ ص ۹۰ سے ۱۰۴ تک ۱۵ ر صفحات پر مشتمل ہے۔

حدیثِ قرطاس بھی روافض و اہل سنت میں معرکہ آرا بحث کی حیثیت سے معروف ہے۔ روافض یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مرضِ وصال میں کاغذ مانگا، تاکہ حضرت علی کی خلافت کا پروانہ لکھ دیں، لیکن حضرت سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لکھنے سے روک دیا۔ اِس فتوے میں حدیثِ قرطاس پر ایسی شان دار بحث فرمائی ہے اور روافض کو ایسے دندان شکن جواب دیے ہیں کہ ان کے تمام اعتراضات دھواں ہو جاتے ہیں۔ یہ طویل فتویٰ بھی ص ۱۰۴ سے ۱۲۳ ر تک بیس صفحات پر مشتمل ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دونوں فتوے ''باغِ فدک اور حدیث قرطاس'' کے نام سے علاحدہ کتابی شکل میں بھی شائع ہو گئے ہیں۔''

(تعارفِ فقیہ ملت مفتی جلال الدین احمد امجدی؛ شامل در: فتاویٰ فیض الرسول ج ۲ ص ۴۶)

الگ کتابی شکل میں مطبوعہ رسالہ تو ہم تک نہیں پہنچ سکا، مگر ''فتاویٰ فیض الرسول'' سے ہی یہ دونوں فتاویٰ حاصل کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔ تیسرا فتویٰ چوں کہ دوسرے سے متعلقہ ہے اس لیے اسے بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

فتویٰ متعلق باغِ فدک

مسئلہ

از

عبدالحق قادری، غوثیہ منزل، منڈی حویلی، پونچھ (جموں کشمیر)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رافضی لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے باغ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دیا تھا جسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں غصب کرلیا۔

اور حضور کا فرمان ہے کہ جس نے فاطمہ کو ستایا اس نے مجھ کو ستایا۔

تو اس حدیث شریف کی روشنی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کیا حال ہے؟

الجواب

بعون الملك العزيز الوهاب

بعض حصہ زمین جو کفار نے مغلوب ہو کر بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا ان میں سے ایک فدک بھی تھا، جس کی آمدنی حضور سید عالم ﷺ اپنے اہل و عیال، ازواج مطہرات وغیرہ پر صرف فرماتے تھے، اور تمام بنی ہاشم کو بھی اس کی آمدنی سے کچھ مرحمت فرماتے تھے، مہمان اور باشاہوں کے سفرا کی مہمان نوازی بھی اس آمدنی سے ہوتی تھی، اس سے غریبوں اور یتیموں کی امداد بھی فرماتے تھے، جہاد کے سامان تلوار، اونٹ اور گھوڑے وغیرہ اس سے خریدے جاتے تھے، اور اصحابِ صفہ کی حاجتیں بھی اس سے پوری فرماتے تھے۔ ظاہر ہے کہ فدک اور اس قسم کی دوسری زمینوں کی آمدنی مذکورہ بالا تمام مصارف کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اسی سبب سے بنی ہاشم کا جو وظیفہ حضور نے مقرر فرما دیا تھا وہ زیادہ نہیں تھا اور سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا جو حضور کو حد سے زیادہ پیاری تھیں مگر آپ ان کی بھی پوری کفالت نہیں فرماتے تھے، جس سے ثابت ہو کہ اس قسم کی زمینوں کی آمدنی مخصوص مدوں میں حضور صرف فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ کا مال اسی کی راہ میں خرچ فرماتے تھے، آپ نے ان کو ذاتی ملکیت نہیں قرار دیا تھا۔

پھر جب سرکار اقدس ﷺ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے بھی فدک کی آمدنی کو انہیں تمام مدوں میں خرچ کیا جن میں حضور

ﷺ خرچ فرمایا کرتے تھے، فدک کی آمدنی خلفائے اربعہ کے زمانہ تک اسی طرح صرف ہوتی رہی، یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت مولا علی رضی اللہ عنہم سب نے فدک کی آمدنی کو انہیں مدوں میں خرچ کیا جن میں حضور خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد باغ فدک حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہا، پھر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اختیار میں رہا، ان کے بعد علی بن حسین اور حسن بن حسن کے ہاتھ آیا، ان کے بعد زید بن حسن بن علی برادرِ حسن بن حسن کے تصرف میں آیا رضی اللہ عنہم، پھر مروان اور مروانیوں کے اختیار میں رہا، یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے باغ فدک حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد کے قبضہ وتصرف میں دے دیا۔

باغِ فدک کی اس تاریخ سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ بھی نہ تھا مگر لوگوں نے بلاوجہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر الزام لگا کر ان کو مطعون کیا۔

حضور نے باغ فدک حضرت فاطمہ کو نہیں دیا تھا

یہ کہنا صحیح نہیں کہ باغ فدک حضور ﷺ نے سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دے دیا تھا، یہ رافضیوں کا اِفترا ہے جس کا جواب دینا ہم پر لازم نہیں۔ یعنی اہل سنت کی معتبر کتابوں سے باغ فدک کا دینا ثابت نہیں بلکہ ہماری کتابوں سے حضور کا حضرت سیدہ کو باغ فدک کا نہ دینا ثابت ہے، جیسا کہ مشہور ومعروف کتاب ابوداؤد شریف کی حدیث ہے:

عن المغيرة، قال: ان عمر بن عبد العزيز جمع بني مروان حين استخلف فقال ان رسول الله صلى الله عليه و سلم كانت له فدك فكان ينفق منها و يعود منها على صغير بني هاشم و يزوج منها ايمهم و ان فاطمة سالته ان يجعلها لها

فابی فکانت کذالك فی حیاة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم حتی مضی لسبیله فلما ان ولّی ابو بکر عمل فیها بما عمل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فی حیاته حتی مضی لسبیله فلما ان ولّی عمر بن الخطاب عمل فیها بمثل ما عملا حتی مضی لسبیله ثم اقطعها مروان ثم صارت لعمر بن عبد العزیز فرایت امرا منعه رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فاطمة لیس لی بحق و انی اشهدکم انی رددتها علٰی ما کانت یعنی علٰی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم و ابی بکر و عمر۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کی خلافت کا جب زمانہ آیا تو انہوں نے بنی مروان کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ فدک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا جس کی آمدنی وہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے تھے اور بنی ہاشم کے بچوں کو پہنچاتے تھے اور اس سے مجرد مرد وعورت کا نکاح بھی کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور سے سوال کیا کہ فدک ان ہی کے لئے مقرر کردیں تو حضور نے انکار کر دیا، تو ایسے ہی آپ کی زندگی بھر رہا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی، پھر جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فدک میں ویسا ہی کیا جیسا کہ حضور نے کیا تھا یہاں تک کہ وہ بھی رحلت فرما گئے، پھر جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ حضور اور ابوبکر نے کیا تھا یہاں تک کہ وہ بھی انتقال فرما گئے، پھر مروان نے (اپنے دور میں) فدک کو اپنی جاگیر میں لے لیا یہاں تک کہ وہ عمر بن عبد العزیز کی جاگیر

بنا، پس مَیں نے دیکھا کہ جس چیز کو حضور نے اپنی بیٹی فاطمہ کو نہیں دیا اس پر میرا حق کیسے ہو سکتا ہے لہٰذا مَیں آپ لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ مَیں نے فدک کو اسی دستور پر واپس کر دیا جس دستور پر کہ وہ پہلے تھا یعنی حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ مبارکہ میں۔

(مشکوٰۃ شریف، ص۳۵۶)

اِس حدیث شریف سے حضور ﷺ کا حضرت سیدہ کو باغ فدک کا نہ دینا واضح طور پر ثابت ہے، بلکہ شرح ابن الحدید جو رافضیوں کی معتبر مذہبی کتاب نہج البلاغہ کی شرح ہے اس میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال لها ابو بكر: لما طلبت فدك بابى و امى انت الصادقة الامينة عندى ان كان رسول الله عهد اليك عهدا و وعدك وعدا صدقتك و سلمت اليك. فقالت: لم يعهد الى فى ذالك۔

جب فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے فدک طلب کیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ میرے نزدیک صادقہ، امینہ ہیں۔ اگر حضور ﷺ نے آپ کے لئے فدک کی وصیت کی ہو یا وعدہ کیا ہو تو اسے مَیں تسلیم کرتا ہوں اور فدک آپ کے حوالے کر دیتا ہوں، تو سیدہ نے فرمایا کہ فدک کے معاملہ میں حضور ﷺ نے میرے لئے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔

اِس روایت سے بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا حضرت سیدہ کو باغ فدک دینے کا جو افسانہ بنایا گیا ہے وہ صحیح نہیں، اس لئے کہ حضرت سیدہ خود فرما رہی ہیں کہ حضور نے فدک کے لئے میرے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی ہے اور نہ وعدہ فرمایا ہے۔

لہٰذا جب حضور نے باغ فدک حضرت سیدہ کو دیا نہیں اور دینے کا وعدہ بھی نہیں فرمایا اور نہ وصیت فرمائی تو پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غصب کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو فدک ہبہ کر دیا تھا تو یہ مسئلہ رافضی وسنی دونوں کے یہاں متفقہ طور پر مسلم ہے کہ ہبہ کی ہوئی چیز پر تاوقتیکہ موہوب لہ یعنی جس کو ہبہ کیا گیا ہے اس کا قبضہ وتصرف نہ ہو جائے وہ چیز موہوب لہ کی ملک نہیں ہو سکتی اور فدک بالاتفاق حضور کی ظاہری حیات میں کبھی حضرت سیدہ کے قبضہ میں نہیں آیا بلکہ حضور ہی کے اختیار میں رہا اور وہی اس میں مالکانہ تصرف فرماتے رہے۔

حضور نے کوئی وراثت نہیں چھوڑی

اگر یہ کہا جائے کہ حضور نے اپنی ظاہری حیات میں حضرت سیدہ کو فدک نہیں دیا تھا ہم نے یہ تسلیم کر لیا لیکن جب وہ حضور کی صاحبزادی تھیں تو فدک حضرت سیدہ کو وراثت میں ضرور ملنا چاہیے تھا کہ ہر شخص اپنے باپ کی جائداد کا وارث ہو اور حضرت سیدہ حضور کی وارث نہ ہوں، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہا درجہ کے فیاض تھے، جو کچھ آتا تھا سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم فرما دیتے تھے، کچھ اپنے پاس باقی نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ حضور ایک بار نماز عصر پڑھ کر فوراً اٹھے اور نہایت تیزی کے ساتھ گھر تشریف لے گئے، پھر علی الفور واپس آ گئے، لوگوں کو تعجب ہوا، تو فرمایا: مجھے خیال آیا کہ سونے کی ایک چیز گھر میں پڑی رہ گئی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑی رہ جائے، اس لئے میں اسے خیرات کرنے کہ لئے کہہ آیا ہوں۔

(رواہ البخاری. مشکوۃ ص۱۶۶)

اور حدیث شریف میں ہے کہ آخری بیماری میں حضور کی ملکیت میں چھ سات

اشرفیاں تھیں، حضور نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ اسے خیرات کر دیں، مگر وہ مشغولیت کے سبب خیرات نہ کر سکیں تو حضور نے ان اشرفیوں کو منگا کر خیرات کر دیا اور فرمایا:

ما ظن نبی اللّٰہ لو لقی اللّٰہ عزوجل و ھذہ عندہ۔

(رواہ احمد. مشکوٰۃ ص ۱۶۷)

یعنی اللہ کا نبی خدائے تعالیٰ سے اس حال میں ملے کہ اشرفیاں اس کے قبضہ میں ہوں تو یہ مقامِ نبوت کے منافی ہے۔ (اشعۃ اللمعات جلد دوم ص ۴۸)

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنی ذاتی ملکیت میں کوئی چیز چھوڑی ہی نہیں تو ایسی صورت میں وراثت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لئے کہ وراثت اس چیز میں جاری ہوتی ہے جو مورث کی ملکیت ہو اور سرکار اقدس نے ایسا کوئی مال چھوڑا ہی نہیں، اور ازواج مطہرات جو اپنے حجروں کی مالک ہوئیں تو وہ بطور میراث ان کو نہیں ملے تھے بلکہ حضور نے اپنی ظاہری حیات میں ایک ایک حجرہ بنوا کر ان کو ہبہ کر دیا تھا اور اسی زمانہ میں ان لوگوں نے اپنے اپنے حجروں پر قبضہ بھی کر لیا تھا اور ہبہ جب قبضہ کے ساتھ ہو تو ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، جیسے کہ حضور نے حضرت فاطمہ کے لئے بھی گھر بنوا کر ان کے قبضہ میں دے دیا تھا جو ان کی ملکیت تھا، اور پھر فدک مال فے سے تھا، اسی لئے محدثین کرام فدک کی حدیث کو باب الفیء میں لائے ہیں اور فے کسی کی ملکیت نہیں ہوتا، اس کے مصارف کو خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود بیان فرمایا ہے:

ما افاء اللّٰہ علٰی رسولہ من اھل القرٰی فللّٰہ و للرسول و لذی القربٰی و الیتٰمٰی و المسٰکین و ابن السبیل۔

جو فے دلایا اللہ نے اپنے رسول کو شہر والوں سے وہ اللہ اور رسول کی ہے

اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔

(پارہ ۲۸ ع ۴)

اور مرقاۃ شرح مشکوٰۃ جلد چہارم ص ۳۱۳ پر مُغرب سے ہے:

حکمه ان یکون لکافة المسلمین۔

فے کا حکم یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے لئے ہے۔

اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

حکم فی آنست کہ مر عامہ مسلمانان را می باشد و در وے خمس و قسمت نیست واختیار آں بدست آنحضرت ست۔

فے کا حکم یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں کے لئے ہے، اس میں خمس و تقسیم نہیں ہے اور اس کی تولیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۴۴۶)

معلوم ہوا مال فے وقف ہوتا ہے، کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فدک کی آمدنی کو قرآن کی تصریح کے مطابق اپنی ذات پر، ازواج مطہرات اور بنی ہاشم پر، غریبوں، مسکینوں اور مسافروں پر خرچ فرما دیتے تھے جو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ فدک کسی کی ملکیت نہیں تھا بلکہ وقف تھا اور مال وقف میں میراث جاری ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

انبیائے کرام کسی کو مال کا وارث نہیں بناتے

اگر فدک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت مان بھی لی جائے پھر بھی اس میں وراثت نہیں جاری ہوگی بلکہ وہ صدقہ ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: لا نورث ما تركناه صدقة۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم (گروہِ انبیا) کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے، ہم جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۵۵۰)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور کے وصال فرما جانے کے بعد ازواج مطہرات نے چاہا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حضور کے مال سے اپنا حصہ تقسیم کروائیں، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

الیس قد قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم: لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔

کیا حضور نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ ہم کسی کو اپنے مال کا وارث نہیں بناتے، جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ سب صدقہ ہے۔ (مسلم شریف جلد دوم ص ۹۱)

جب حضرت عائشہ نے ازواج مطہرات کو یہ حدیث شریف سنائی تو انہوں نے میراث طلب کرنے کا ارادہ ختم کر دیا۔

اور حضرت عمرو بن الحارث رضی اللہ عنہ جو جویریہ زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی تھے، انہوں نے فرمایا:

ما ترك رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم عند موتہ دینارًا و لا درھمًا و لا عبدًا و لا امۃً و لا شیئًا الا بغلتہ البیضاء و سلاحہ و ارضا جعلھا صدقۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کے وقت درہم و دینار اور غلام و باندی کچھ نہیں چھوڑا، مگر ایک سفید خچر، اپنا ہتھیار اور کچھ زمین جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کر دیا تھا۔ (رواہ البخاری. مشکوٰۃ ص ۵۵)

اور بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال: لا یقتسم ورثتی

دینارا ما ترکت بعد نفقة نسائی و مؤنة عاملی فهو صدقة۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث ایک دینار بھی تقسیم نہیں کریں گے، مَیں جو کچھ چھوڑ جاؤں میری ازواج کے مصارف اور عاملوں کا خرچ نکالنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۵۵)

اور بخاری و مسلم میں حضرت مالک بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجمع صحابہ جن میں حضرت عباس، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم موجود تھے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سب کو قسم دے کر فرمایا: کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ حضور نے فرمایا کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے؟ تو سب نے اقرار کیا کہ ہاں، حضور نے ایسا فرمایا ہے۔ حدیث شریف کے اصل الفاظ یہ ہیں:

انشدکم باللّٰہ الذی باذنہ تقوم السماء و الارض هل تعلمون ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم قال: لا نورث ما ترکنا صدقة؟ قالوا: قد قال ذالك، فاقبل عمر علی علی و عباس فقال انشدکما باللّٰہ هل تعلمان ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم قد قال ذالك؟ قالا: نعم۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے، ہم جو چھوڑیں وہ صدقہ ہے؟ تو ان لوگوں نے کہا: بے شک حضور نے ایسا فرمایا ہے، پھر وہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میں آپ دونوں کو خدائے پاک کی قسم دیتا ہوں کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ

حضور نے ایسا فرمایا ہے؟ تو ان لوگوں نے بھی کہا کہ ہاں، حضور نے ایسا فرمایا ہے۔ (بخاری ج ۲ ص ۵۷۵، مسلم ج ۲ ص ۹۰)

ان احادیث کریمہ کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آیا اور حضور کا ترکہ خیبر اور فدک وغیرہ ان کے قبضہ میں ہوا اور پھر ان کے بعد حسنین کریمین وغیرہ کے اختیار میں رہا مگر ان میں سے کسی نے ازواج مطہرات، حضرت عباس اور ان کی اولاد کو باغ فدک وغیرہ سے حصہ نہ دیا، لہذا ماننا پڑے گا کہ نبی کے ترکہ میں وراثت جاری نہیں ہوتی، ورنہ یہ تمام بزرگوار جو رافضیوں کے نزدیک معصوم اور اہل سنت کے نزدیک محفوظ ہیں حضرت عباس اور ازواج مطہرات کی حق تلفی جائز نہ رکھتے۔

ان تمام شواہد سے خوب واضح ہو گیا کہ انبیائے کرام کے ترکہ میں وراثت نہیں جاری ہوتی، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کو باغ فدک نہیں دیا، نہ کہ بغض وعداوت کے سبب جیسا کہ رافضیوں کا الزام ہے، اس لئے کہ اگر حضرت سیدہ سے ان کو دشمنی تھی تو ازواج مطہرات کو حضور کے ترکہ سے حصہ پہنچتا تو ان سے اور ان کے باپ بھائی وغیرہ متعلقین سے کیا عداوت تھی کہ ان سب کو محروم المیراث کر دیا جب کہ حضرت عائشہ صدیقہ ان کی صاحبزادی بھی ازواج مطہرات میں سے تھیں، بلکہ حضرت عباس حضور کے چچا اور حضرت ابوبکر کے ابتدائے خلافت سے مشیر ورفیق تھے جن کو تقریباً نصف ترکہ ملتا وہ کس دشمنی کے سبب وراثت سے محروم ہوئے؟ لہذا ماننا پڑے گا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد رسول **لا نورث ما ترکنا صدقة** کے سبب حضرت سیدہ کو فدک نہ دیا کہ حدیث پر عمل کرنا ان پر لازم تھا۔ اس لئے کہ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت سیدہ کو خوش کرنے کے لئے انہیں حدیث کو پس پشت ڈال دینا چاہیے تھا اور ارشاد رسول پر انہیں عمل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور جب

حضرت ابو بکر صدیق نے حدیث رسول پر عمل کیا تو ان پر الزام کیا ہے جبکہ یہ روایت کہ حضرات انبیاء کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے رافضیوں کی معتبر کتابوں سے بھی ثابت ہے، جیسا کہ اصول کافی باب العلم و المتعلم میں ہے:

عن ابی عبد اللّٰه علیه السلام، قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: ان العلماء ورثة الانبیاء و ان الانبیاء لم یورثوا دینارا و لا درهما و لکن اورثوا العلم فمن اخذه منه اخذ بحظ وافر۔

ابو عبد اللہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علمائے دین انبیائے کرام کے وارث ہیں، اس لئے کہ انبیائے کرام کسی شخص کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے، تو جس شخص نے علم دین حاصل کیا اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔

اور اسی کتاب اصول کافی کے باب صفة العلم میں ہے:

عن ابی عبد اللّٰه علیه السلام، قال: ان العلماء ورثة الانبیاء و ذالك ان الانبیاء لم یورثوا درهما و لا دینارا و انما اورثوا احادیث من احادیثهم فمن اخذه بشیء منها فقد اخذ حظا وافرا۔

حضرت ابو عبد اللہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ علمائے کرام انبیائے عظام کے وارث ہیں اور یہ اس لئے کہ حضرات انبیائے کرام نے کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بنایا، انہوں نے تو صرف اپنی باتوں کا وارث بنایا، تو جس شخص نے ان کی باتوں کو حاصل کر لیا اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ جو رافضیوں کے نزدیک معصوم ہیں اور اہل سنت کے نزدیک محفوظ ہیں ان کی روایتوں سے بھی ثابت ہو گیا کہ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی میراث صرف علم شریعت ہی ہے وہ درہم و دینار اور مال و اسباب کا کسی کو وارث نہیں بناتے اور جب یہ بات رافضیوں کی روایات سے بھی ثابت ہے تو پھر سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم نہ کرنے کے سبب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر فدک کے غصب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہیں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وورث سلیمان داؤد وغیرہ قرآن و حدیث میں جہاں بھی انبیائے کرام کی وراثت کا ذکر ہے اس سے علم شریعت و نبوت مراد ہے نہ کہ درہم و دینار۔

اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث نہ جاری ہوتی تو حضرت ابو بکر حضرت علی کو حضور کی تلوار، زرہ اور دلدل وغیرہ کیوں دیتے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی کو حضور کی تلوار وغیرہ کا دینا ہی اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ حضور کے ترکہ میں میراث نہیں، اس لئے کہ حضرت علی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث نہ تھے، اگر حضور کے ترکہ کے وارث ہوتے تو صرف فاطمہ زہرا، ازواجِ مطہرات اور حضرت عباس ہوتے نہ کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہم)، مگر چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مال وفات کے بعد عامۂ مسلمین کے لئے وقف کا حکم رکھتا ہے اس لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان چیزوں کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو زیادہ لائق سمجھا تو ان کے لئے مخصوص کر دیا اور بعض چیزیں حضرت زبیر بن العوام اور حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کو بھی دیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث نہیں۔

حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہ کو نہیں ستایا۔ رضی اللہ عنہما

بے شک جس نے فاطمہ کو ستایا اس نے حضور کو ستایا اور جس نے فاطمہ کو ایذا دی اس نے حضور کو ایذا دی۔ اس مضمون کی حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں:

قال: فاطمة بضعة منی فمن اغضبها اغضبنی. و فی روایة: یریبنی ما ارابها و یوذینی ما اذاها۔

سرکار اقدس ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے تو جو شخص اس کو غضب میں لایا مجھ کو غضب میں لایا۔

اور ایک روایت میں ہے: مجھ کو اضطراب میں ڈالتی ہے جو چیز فاطمہ کو اضطراب میں ڈالتی ہے اور مجھ کو تکلیف دیتی ہے جو چیز اس کو تکلیف دیتی ہے۔

(بخاری، مسلم. مشکوۃ ص ۵۶۸)

یہ حدیث شریف حق ہے جس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن یہ سمجھنا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ کو ستایا، یہ غلط ہے۔

ستانے کا مفہوم کیا ہے؟ جب حضرت سیدہ نے حضرت ابو بکر سے فدک کا مطالبہ کیا تو انہوں نے وہ حدیث شریف سنائی کہ جس کی تصدیق بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ یہاں تک کہ حضرت علی بھی کرتے ہیں تو حضرت سیدہ خاموش ہو گئیں۔ کیا حدیث سنانا اور اس پر عمل کرنا سیدہ فاطمہ کو ستانا ہے؟ کون مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ حدیث پر عمل کر کے مجھ کو ستایا گیا اور جب عام مسلمانوں کو حدیث رسول پر عمل کرنے سے تکلیف نہیں پہنچ سکتی تو حضرت فاطمہ زہرا جو حضور کی لختِ جگر اور نورِ نظر ہیں ان کو حضور کی حدیث پر عمل کرنے سے کیوں کر تکلیف پہنچ سکتی ہے۔

اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ حضرت سیّدہ کو حدیث رسول پر عمل کرنے کے سبب تکلیف پہنچی جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے تو خود حضرت سیدہ پر الزام آتا ہے کہ ان کو حدیث رسول سے تکلیف پہنچی اور یہ بات سیدہ کی ذات سے ناممکن ہے۔

ہاں، بخاری شریف کی بعض روایتوں میں حضرت سیدہ اور حضرت ابو بکر کے سوال و جواب کو نقل کرنے کے بعد حدیث کے راوی نے اپنے خیال کو اس طرح ظاہر

کیا ہے:

فغضبت فاطمة و هجرت ابا بكر فلم تزل مهاجرته حتى توفيت و عاشت بعد رسول الله ستة اشهر۔

پس حضرت فاطمہ ناراض ہوگئیں اور انہوں نے حضرت ابوبکر کو چھوڑے رکھا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی اور حضرت فاطمہ حضور کے بعد چھ ماہ باحیات رہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ یہ الفاظ حضرت سیدہ کی زبان سے نہیں نکلے ہیں، بلکہ یہ حدیث کے راوی کا اپنا ذاتی خیال ہے جس کو انہوں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ یعنی حضرت ابوبکر کی شکایت کسی روایت میں حضرت سیدہ کی زبان سے ثابت نہیں ہے، نہ کوئی حدیث کا راوی یہ کہتا ہے کہ ہم نے ابوبکر کی شکایت جناب سیدہ سے سنی ہے اور چونکہ ناراضگی دل کا فعل ہے، اس لئے جب تک اس کو زبان سے ظاہر نہ کیا جائے دوسرے شخص کو اس کی خبر نہیں ہوسکتی، البتہ آثار وقرائن سے دوسرے لوگ قیاس کر سکتے ہیں مگر ایسے قیاس میں غلطی ہو جانے کا بہت امکان ہے، جیسے کہ ایک بار بہت سے صحابہ کرام نے حضور ﷺ کی خلوت نشینی سے یہ نتیجہ نکالا کہ حضور نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے، مگر جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضور سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ طلاق نہیں دی ہے۔ اسی طرح فدک کے معاملہ میں بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت سیدہ کی خاموشی اور ترک کلام سے راوی نے یہ سمجھ لیا کہ حضرت سیدہ ناراض ہیں حالانکہ یہ بات نہیں کہ ناراضگی ہی ترک کلام کا سبب ہو بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے والد گرامی کی حدیث سن کر وہ مطمئن ہوگئی ہوں، اس لئے پھر کبھی انہوں نے حضرت ابوبکر سے فدک کے معاملہ میں گفتگو نہیں کی۔

اور حضرت سیدہ کے ناراض نہ ہونے کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ وہ برابر

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے گھر کے سارے اخراجات لیتی تھیں اور ان کی بیوی اسما بنت عمیس حضرت سیدہ کی تیمارداری کرتی تھیں، اگر واقعی حضرت سیدہ ناراض ہوتیں تو ان کی اور ان کی بیوی کی خدمات وہ ہرگز قبول نہ فرماتیں۔

اور پھر حضور نے یہ فرمایا:

من اغضبها اغضبنی۔

یعنی جو شخص اپنے قول یا فعل سے قصداً فاطمہ کو غضب میں لائے اس کے لیے وعید ہے۔

اِس لئے کہ اِغضاب کے معنی یہی ہیں اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کبھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غضب میں لانے اور ایذا پہنچانے کا قصد ہرگز نہیں کیا، بلکہ وہ بارہا مقامِ عذر میں فرماتے رہے:

یا ابنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم ان قرابة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم احب الی من ان اصل قرابتی۔

قسم ہے خدا کی اے رسول اللہ کی صاحبزادی! مجھے اپنی قرابت سے حضور کی قرابت کے ساتھ صلہ رحمی زیادہ محبوب ہے۔

اور اگر حضرت سیدہ کا غضب میں ہونا بہ مقتضائے بشریت مان بھی لیا جائے تو یہ ان کا اپنا فعل ہے، حضرت ابو بکر پر کوئی الزام نہیں اس لئے کہ اغضاب یعنی قصداً غضب میں لانے پر وعید ہے نہ کہ غضب پر۔

ہاں، اگر اس لفظ کے ساتھ وعید ہوتی کہ **من غضبت علیه** یعنی جس پر فاطمہ غصہ ہوں گی تو اس پر میں غصہ ہوں گا، تو اس صورت میں البتہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر الزام عائد ہوتا۔

مگر اس طرح کے الزام سے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی نہیں بچ سکتے۔ اس لئے کہ

حضرت سیدہ بارہا ان پر غصہ ہوئی ہیں، جیسا کہ رافضیوں کی معتبر کتاب جلاء العیون ص ۱۸۶ پر ہے:

ایک بار حضرت سیدہ زہرا مولیٰ علی سے ناراض ہوئیں تو حسن و حسین اور ام کلثوم کو لے کر اپنے میکہ چلی گئیں۔

بلکہ بعض مرتبہ اس قدر غصہ ہوتی تھیں کہ حضرت علی کو سخت وست بھی کہہ دیا کرتی تھیں، جیسا کہ رافضی مذہب کی مشہور کتاب حق الیقین کے ص ۲۳۳ پر ہے کہ حضرت سیدہ نے ایک بار حضرت علی سے ناراض ہو کر یہ جملہ کہہ دیا:

مانند جنین دررحم پردہ نشین شدہ و مثل خائباں در خانہ گریختہ۔

حمل کے بچہ کی طرح ماں کے پیٹ میں چھپ گئے اور نامرادوں کی طرح گھر میں بیٹھ گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رافضی اور سنی دونوں کی معتبر کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جس سے حضرت سیدہ کا حضرت علی پر ناراض ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ ان کی ناراضگی حضرت علی سے وقتی اور عارضی ہوتی تھی، پھر اس کے بعد آپ راضی بھی ہوجاتی تھیں، تو ہم کہتے ہیں: اول تو حضرت ابوبکر پر حضرت سیدہ کی زبان سے ناراض ہونا ہی ثابت نہیں، اور اگر حدیث شریف کے راوی کے خیال کو صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ ناراضگی بھی عارضی اور وقتی تھی، جیسا کہ رافضی اور سنی دونوں کی روایتوں سے ثابت ہے کہ مطالبہ فدک کے بعد حضرت سیدہ نے حضرت ابوبکر سے بولنا چھوڑ دیا، تو آپ نے حضرت علی کو اپنا سفارشی بنایا، یہاں تک کہ حضرت زہرا آپ سے راضی ہوگئیں، جیسا کہ سنیوں کی کتاب مدارج النبوۃ، کتاب الوفا، بیہقی اور شروح مشکوۃ میں یہ روایت موجود ہے، بلکہ محدث کبیر حضرت شیخ عبدالحق دہلوی بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مطالبہ فدک کے بعد حضرت سیدہ کے گھر گئے اور دھوپ میں ان کے دروازہ پر کھڑے ہوئے یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سے راضی ہو گئیں۔ (اشعۃ اللمعات جلد سوم ص ۴۵۴)

اور رافضیوں کی کتاب محجاج السالکین میں ہے:

ان ابا بكر لما راى ان فاطمة انقبضت عنه و هجرته و لم تتكلم بعد ذالك فى امر فدك و كبر ذالك عنده فاراد استرضائها فاتاها فقال لها: صدقت يا ابنة رسول الله فيما ادعيت و لكنى رايت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقسمها فيعطى الفقراء و المساكين و ابن السبيل بعد ان يؤتى منها قوتكم و الصانعين بها. فقال: افعل فيها كما كان ابى رسول الله صلى الله عليه و سلم يفعل فيها فقال: ذالك الله على ان افعل فيها ما كان يفعل ابوك فقالت: و الله لتفعلن. فقال: والله لافعلن. فقالت: اللهم اشهد فرضيت بذالك و اخذت العهد عليه و كان ابو بكر يعطيهم منها قوتهم و يقسم الباقى فيعطى الفقراء و المساكين و ابن السبيل۔

بے شک جب حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ فاطمہ مجھ سے تنگ دل ہو گئیں اور چھوڑ دیا اور فدک کے بارے میں بات کرنا ترک کر دیا تو یہ ان پر بہت گراں ہوا انہوں نے حضرت سیدہ کو راضی کرنا چاہا تو ان کے پاس گئے اور کہا: اے رسول کی صاحبزادی! آپ نے جو کچھ دعویٰ کیا تھا سچا تھا، لیکن میں نے حضور کو دیکھا کہ وہ فدک کی آمدنی کو فقیروں، مسکینوں اور

مسافروں کو بانٹ دیتے تھے، اسی میں سے آپ کو اور فدک میں کام کرنے والوں کو دیتے تھے تو حضرت سیدہ نے کہا کہ کرو جیسا کہ میرے باپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے تو حضرت ابوبکر نے کہا: قسم ہے خدا کی میں آپ کے واسطے وہ کام کروں گا جو آپ کے والد گرامی کرتے تھے تو حضرت سیدہ نے کہا: قسم ہے خدا کی آپ ضرور ویسا ہی کریں گے، پھر حضرت ابوبکر نے کہا: خدا کی قسم میں ضرور کروں گا۔ تو حضرت سیدہ نے کہا: اے خدا! تو گواہ ہے پھر حضرت سیدہ راضی ہو گئیں اور حضرت ابوبکر سے عہد لیا اور وہ فدک کی آمدنی سے پہلے حضرت سیدہ وغیرہا کو دیتے تھے پھر باقی فقیروں، مسکینوں اور مسافروں کو بانٹ دیتے تھے۔

حضرت سیّدہ حضرت ابوبکر سے ناراض نہیں تھیں۔ رضی اللہ عنہما

رافضی لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت کر دی تھی کہ ابوبکر میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کو رات ہی میں دفن کر دیا، جس سے معلوم ہوا کہ سیدہ ان سے راضی نہیں ہوئی تھیں اور ان لوگوں کے مابین صلح صفائی نہیں ہوئی تھی۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کی معتبر کتابوں سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا نے یہ وصیت کی تھی کہ حضرت ابوبکر میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں۔ یہ رافضیوں کا افتراء و بہتان ہے، اس لئے کہ وہ ایسی وصیت کیسے کر سکتی تھیں جبکہ نماز جنازہ پڑھانے کا حق بحیثیت امیر المومنین حضرت ابوبکر ہی کو تھا، اسی لئے امام حسین رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے حاکم مروان بن حکم کو (اور ایک روایت کے مطابق سعید بن عاص کو) حضرت امام حسن کا جنازہ پڑھانے سے نہیں روکا اور فرمایا کہ اگر شریعت کا حکم ایسا نہ ہوتا تو میں جنازہ کی نماز تمہیں نہ پڑھانے دیتا۔ (اشعۃ اللمعات جلد سوم ص ۴۵۴)

اور جب نماز جنازہ پڑھانے کا حق خلیفۃ المسلمین ہی کو تھا تو حضرت سیدہ کسی کی حق تلفی کی وصیت ہرگز نہیں کر سکتیں۔

معلوم ہوا کہ اس قسم کی وصیت کی نسبت حضرت سیدہ کی جانب غلط ہے، البتہ انہوں نے مرض الموت میں یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد مجھے بے پردہ مردوں کے سامنے نہ نکالیں، اس لئے کہ اس زمانہ میں یہ رسم تھی کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی بے پردہ نکالتے تھے۔ تو حضرت ابو بکر کی بیوی اسما بنت عمیس نے حضرت سیدہ کے جنازہ کے لئے لکڑیوں کا ایک گہوارہ بنایا جس کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئیں، لہٰذا ان کی وصیت انتہائی شرم وحیا کے سبب سے تھی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لئے خاص نہ تھی بلکہ عام تھی، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ کو رات ہی میں دفن کر دیا۔

اور سیدہ کے جنازہ میں حضرت ابو بکر صدیق کا شریک نہ ہونا بخاری یا صحاح کی کسی روایت سے ثابت نہیں بلکہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ان کی نماز جنازہ حضرت ابو بکر صدیق ہی نے پڑھائی، جیسا کہ طبقات ابن سعد میں امام شعبی اور امام نخعی سے دو روایتیں مروی ہیں:

عن الشعبی، قال: صلی علیھا ابو بکر رضی اللّٰہ عنہ و عن ابراھیم، قال: صلی ابو بکر الصدیق علی فاطمۃ بنت رسول اللّٰہ و کبر علیھا اربعا۔

حضرت امام شعبی اور ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ حضور کی صاحبزادی حضرت فاطمہ کی نماز جنازہ حضرت ابو بکر نے پڑھائی اور نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہیں۔

اور اگر جنازہ میں شریک نہ ہونا مان بھی لیا جائے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علی نے حضرت ابو بکر کو بلانے کے لئے کسی کو نہ بھیجا ہو، تو حضرت ابو بکر نے

سمجھا ہو کہ اس میں کوئی مصلحت ہے، اس لئے شریک نہ ہوئے ہوں۔

اور حضرت علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر انتظار میں رہے ہوں کہ ان کو بلایا جائے گا اور حضرت علی نے یہ خیال کیا ہو کہ وہ خود آئیں گے اور رات کا وقت تھا، اس لئے ان کی شرکت کے بغیر تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ **کذا ذکرہ السمھودی فی تاریخ المدینۃ۔** (اشعۃ اللمعات جلد سوم ص ۴۵۴)

اور اگر رافضی کسی بات کو نہ مانیں اور جنازہ میں شرکت نہ کرنے کی وجہ حضرت سیدہ کی وصیت ہی کو ٹھہرائیں تو پھر ان کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا کہ سیدہ کی نماز جنازہ صرف سات آدمیوں نے پڑھی، جیسا کہ رافضیوں کی معتبر کتاب جلاء العیون میں کلینی سے روایت ہے کہ

از امیر المومنین صلوات اللہ تعالیٰ علیہ روایت کردہ است کہ ہفت کس بر جنازۂ فاطمہ نماز کردند ابوذر و عمار و حذیفہ و عبد اللہ بن مسعود و مقداد و من امامِ ایشاں بودم۔

امیر المومنین حضرت علی سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ صرف سات آدمیوں نے فاطمہ کی نماز جنازہ پڑھی؛ ابوذر، سلمان، عمار، حذیفہ، عبد اللہ بن مسعود، مقداد اور مَیں ان کا امام تھا۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ صرف سات آدمیوں نے حضرت سیدہ کی نماز جنازہ پڑھی اور مندرجہ ذیل حضرات ان کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے:

حضرت امام حسن

حضرت امام حسین

حضرت عبد اللہ بن عباس

حضرت عقیل بن ابی طالب

حضرت جعفر بن ابی طالب

حضرت قیس بن سعد

حضرت ابوایوب انصاری

حضرت ابوسعید خدری

حضرت سہل بن حنیف

حضرت بلال

حضرت صہیب

حضرت برا ابن عازب

اور حضرت ابورافع رضی اللہ عنہم

یہ تیرہ حضرات جن کو رافضی بھی مانتے ہیں اور یہ لوگ نماز جنازہ میں شریک نہ ہوئے، ان کے بارے میں وہ کیا کہیں گے؟ کیا حضرت سیدہ ان سے بھی ناراض تھیں؟ کیا انہوں نے یہ بھی وصیت کر دی تھی میرے جنازہ میں امام حسن و امام حسین بھی شریک نہ ہوں جو ان کے لاڈلے اور چہیتے بیٹے تھے؟ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جنازہ میں شریک ہونے نہ ہونے کو رضا مندی یا ناراضگی کی بنیاد بنانا ہی غلط ہے، ورنہ حضرات حسنین کے بارے میں بھی کہنا پڑے گا کہ ان حضرات سے سیدہ ناراض تھیں اور جنازہ میں شریک نہ ہونے کے لئے وصیت کر گئی تھیں۔

تو ثابت ہوا کہ اگر حضرت ابوبکر صدیق نے حضرت سیدہ کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی، تو اس کو آپ سے حضرت سیدہ کی ناراضگی کی دلیل ٹھہرانا غلط ہے۔

حضرت ابوبکر نے حضرت سیدہ کو اپنی پوری جائداد پیش کی

رضی اللہ تعالیٰ عنہما

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت التجا کے ساتھ اپنی پوری جائداد حضرت

سیدہ کو پیش کی جیسا کہ رافضیوں کی معتبر کتاب۔ حق الیقین میں ہے کہ حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فدک کا مطالبہ کیا تو انہوں نے حدیث رسول: لا نورث ما ترکناہ صدقۃ کو سنانے کے بعد بہت معذرت کی اور کہا کہ

امول و احوال خود را از تو مضائقہ نمی کنم آں چہ خواہی بگیر تو سیدۂ امت پدر خودی و شجرہ طیبہ از برائے فرزنداں خود انکار فضل تو کسے نمی تواند گرد دتو حکم تو نافذ ست در اموال من اما در اموال مسلماناں مخالفت گفتہ پدر تو نمی توانم کرد۔

میرے جملہ اموال و احوال میں آپ کو اختیار ہے، آپ جو چاہیں بلا روک ٹوک لے سکتی ہیں، آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی سردار ہیں اور آپ کے فرزندوں کے لیے شجرۂ مبارکہ میں آپ کی فضیلت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور آپ کا حکم میرے تمام مالوں میں نافذ ہے، لیکن مسلمانوں کے مالوں میں آپ کے والد ماجد سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی مخالفت مَیں نہیں کر سکتا۔ (حق الیقین: ملا مجلسی ص ۲۳۱)

رافضیوں کی اس مذہبی کتاب سے خوب واضح ہو گیا کہ حضرت سیدہ حضرت ابو بکر کے نزدیک بہت محترم تھیں، وہ حضرت سیدہ کی بہت عزت کرتے تھے، ہرگز ہرگز ان کے دل میں حضرت سیدہ کی طرف سے کوئی بغض و عناد نہ تھا، صرف حدیث رسول کے سبب فدک ان کے حوالہ نہ کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دامن ہر طرح کے الزام سے پاک ہے، اور ان پر باغ فدک کے غصب اور حضرت سیدہ کی دشمنی کا الزام لگانا سراسر غلط ہے۔

اِس مفصل جواب کا مقصد بحث ومناظرہ نہیں ہے، بلکہ اپنے مسلک کی وضاحت اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی واجب الاحترام ہستی پر جو طعن کیا جاتا ہے اس سے مدافعت مقصود ہے۔ خدائے تعالیٰ سب کو ہٹ دھرمی سے بچائے اور حق بات قبول کرنے کی سب کو توفیق بخشے۔ آمین برحمتك يا ارحم الراحمين و صلى الله تعالیٰ علی سیدنا محمد و علی آله و اصحابه اجمعين۔

كتبه

جلال الدین احمد امجدی

۲۴ رذی القعدہ ۱۴۰۰ھ

فتویٰ متعلق حدیث قرطاس

مسئلہ

از

محمد قمر الدین قادری چشتی، ڈاک خانہ منڈی، ضلع پونچھ (جموں کشمیر)

کیا فرماتے ہیں علمائے ملت اسلامیہ اس مسئلہ میں کہ رافضی لوگ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے وفات سے پہلے درد کی شدت میں صحابہ سے فرمایا کہ قلم دوات لاؤ، تاکہ میں تم لوگوں کے لئے ایک تحریر لکھ دوں، جس سے تم لوگ کبھی گمراہ نہ ہو، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس وقت حضور کو درد کی شدت ہے، وہ ہذیان بول رہے ہیں، لکھنے کا سامان لانے کی ضرورت نہیں، تمہارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ اس بات پر جب صحابہ نے قلم دوات لانے میں اختلاف کیا اور لوگوں کی گفتگو سے شور وغل ہوا تو حضور نے سب کو اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ اس واقعہ سے چار اعتراض پیدا ہوتے ہیں:

۱- اول یہ کہ حضرت عمر نے حضور ﷺ کے قول کو رد کر دیا، حالانکہ حضور کا قول وحی ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: و ما ینطق عن الھوای ان ھو الا وحی یوحی۔ اور وحی کا رد کرنا کفر ہے۔

۲- دوسرے یہ کہ حضور سید الانبیا ﷺ کی طرف ہذیان کی نسبت کی یعنی بہکی بہکی باتیں کرنا، اس میں حضور کی توہین ہوئی، اس لئے کہ نبی کو کبھی جنون نہیں ہوسکتا اور نہ کبھی وہ بہکی بہکی باتیں کرسکتا ہے۔

۳- تیسرے یہ کہ حضور ﷺ کے سامنے لوگوں نے شوروغل کیا اور چلائے، جبکہ قرآن حکیم میں ہے کہ جو پیغمبر کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرے گا اس کی سب نیکیاں برباد ہوجائیں گی۔

۴- چوتھے یہ کہ لکھنے کا سامان نہ دینے سے مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی، اگر حضور تحریر فرمادیتے تو مسلمان گمراہی سے محفوظ ہوجاتے۔

ان اعتراضوں کے مدلل اور مفصل جواب تحریر فرمائیں، کرم ہوگا!

الجواب

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم.
نحمده و نصلی علی رسوله الکریم.
جوابات لکھنے سے پہلے ہم اس واقعہ سے متعلق دو روایتیں درج کرتے ہیں، تا کہ اصل واقعہ معلوم ہو جانے کے بعد جوابات کے سمجھنے میں آسانی ہو:

پہلی روایت

عن سعید بن جبیر، قال: قال ابن عباس: یوم الخمیس اشتد برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم وجعه، فقال: ایتونی بکتف اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعده ابدا فتنازعوا و لا ینبغی عند نبی تنازع فقالوا ما شانه اهجر استفهموه فذهبوا یردون علیه، فقال: دعونی ذرونی فالذی انا فیه خیر مما تدعوننی الیه فامرهم بثلث فقال: اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب و اجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزهم و سکت عن الثالثة۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جمعرات کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درد زیادہ ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس شانہ کی ہڈی لاؤ، میں تمہارے

لئے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ اس کے بعد تم لوگ کبھی نہ بہکو! تو لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا اور نبی کے پاس اختلاف مناسب نہیں۔ تو کئی لوگوں نے کہا کہ حضور کا کیا حال ہے؟ کیا جدائی کا وقت قریب آ گیا ہے؟ آپ سے دریافت کرلو! بعض صحابہ نے لکھنے کے بارے میں آپ سے دریافت کرنا شروع کیا، تو جواب میں آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اس لئے کہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے کہ جس کی طرف تم لوگ مجھے بلا رہے ہو۔ اور آپ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی: اول مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو! دوم ایلچیوں کو انعام دو جیسا کہ میں دیتا تھا، یہ کہہ کر تیسری وصیت سے خاموش ہو گئے یا راوی نے کہا کہ میں اس کو بھول گیا۔ (بخاری، مسلم)

دوسری روایت

عن ابن عباس، قال: لما حضر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم و فی البیت رجال فیهم عمر بن الخطاب، قال النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم: هلموا اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعده، فقال عمر: قد غلب علیه الوجع و عندکم القرآن حسبکم کتاب اللّٰہ فاختلف اهل البیت و اختصموا من یقول قربوا یکتب لکم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم و منهم من یقول ما قال عمر فلما اکثروا اللغط و الاختلاف، قال رسول اللّٰہ: قوموا عنی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ جب حضور کے وصال کا وقت قریب آیا تو حجرۂ مبارکہ میں بہت سے لوگ موجود

تھے، جن میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آؤ میں تم لوگوں کے لئے ایک تحریر لکھ دوں تا کہ اس کے بعد تم نہ بھکو، تو حضرت عمر نے کہا کہ اس وقت حضور کو بیماری کی تکلیف زیادہ ہے، تمہارے پاس قرآن ہے، وہی اللہ کی کتاب تمہارے لئے کافی ہے، تو حجرہ میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے اختلاف کیا، بعض لوگ کہتے تھے کہ حضور کے پاس لکھنے کا سامان رکھ دو تا کہ وہ تمہارے لئے تحریر لکھ دیں، اور بعض لوگ وہی کہتے تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، جب لوگوں نے باتیں بڑھا دیں اور اختلاف زیادہ پیدا ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس سے اٹھ جاؤ! (بخاری و مسلم)

اجمالی جواب

حدیث شریف سے اصل واقعہ کی تفصیل کے بعد اجمالی جواب یہ ہے کہ یہ کام صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا، بلکہ دوسرے صحابہ بھی اس میں شریک ہیں، اس لئے کہ جتنے صحابہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ میں موجود تھے اس معاملہ میں وہ لوگ دو گروہ ہو گئے تھے اور حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت موجود تھے، تو اگر یہ دونوں حضرات لکھنے کا سامان نہ لانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کئے تو یہ سارے الزامات ان دونوں حضرت پر بھی عائد ہوتے ہیں اور اگر یہ لوگ لکھنے کا سامان لانے کی تائید میں تھے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کئے تو اس صورت میں حضور کی بارگاہ میں آواز بلند کرنے اور روکنے والوں کے سبب رک جانے یعنی لکھنے کا سامان حاضر نہ کرنے کا الزام ان دونوں حضرات پر بھی عائد ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے لکھنے کا سامان کیوں نہ پیش کر دیا۔ اور پھر یہ واقعہ جمعرات کا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال دوشنبہ مبارکہ (پیر) کو ہوا، تو فرصت کا موقع بہت تھا۔ حضرت ابن عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما

نے اس درمیان میں حضور سے کیوں نہ لکھالیا، اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ان لفظوں کے ساتھ تھا:

ایتونی بقرطاس۔

یعنی تم لوگ میرے پاس کاغذ لاؤ!

تو یہ حکم سب حاضرین سے تھا نہ کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے، لہٰذا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم فرض یا واجب مانا جائے تو حاضرین میں سے ہر ایک کو گنہ گار تسلیم کرنا پڑے گا، اور اگر فرض و واجب نہ مانا جائے تو ان میں سے کسی پر الزام عائد نہیں ہوتا اور یہی حق ہے۔

رافضیوں کے سارے اعتراضات باطل و غلط ہیں، ہر ایک کے تفصیلی جوابات نمبروار درج ذیل ہیں:

۱۔حضور کے قول کو حضرت عمر نے نہیں رد کیا صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہ

یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو رد کر دیا، اس لئے کہ انہوں نے درد کی شدت میں حضور کے آرام و راحت کا خیال کیا کہ حضور محنت و مشقت میں نہ پڑیں، اور اسے رد نہیں کہتے، ہر شخص اپنے عزیز بیمار کو محنت و مشقت میں پڑنے سے بچاتا ہے، خاص کر بزرگ اگر کسی وقت شدت مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور حاضرین کے فائدہ کے لیے خود ہی کچھ اٹھانا چاہتا ہے تو کوئی بھی اسے گوارا نہیں کرتا، یہی سب لوگوں میں معمول ہے۔ لہٰذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے فائدے کے لیے مشقت میں پڑنا چاہتے ہیں کہ خود لکھیں یا لکھائیں، بہر حال مضمون بتانا یا خود لکھنا شدت مرض میں تکلیف کا سبب ہوگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے از راہِ محبت گوارا نہ کیا اور بلحاظ ادب حضور کو خطاب نہ کیا بلکہ اور لوگوں کو کتاب اللہ کے اشارہ سے ثابت کیا کہ حضور کو مشقت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں، تا کہ حضور کے کان

مبارک تک یہ آواز پہنچے اور آپ جان لیں کہ شدت مرض میں ایسی مشقت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اور اس معاملہ میں عقلمندوں کے نزدیک حقیقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باریک بینی ہے جو لائق صد تعریف ہے کہ تقریباً تین ماہ پہلے یہ آیہ کریمہ نازل ہو چکی تھی:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

آج کے دن مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو تمہارے اوپر تمام کر دیا۔ (پارہ ۶، ع ۵)

تو اس آیہ کریمہ نے نسخ و تبدیل اور دین کے احکام میں کمی بیشی کے دروازے کو بالکل بند کر کے اس پر مہر لگا دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی اسی آیت کریمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

حسبکم کتاب اللّٰہ۔

یعنی اللہ کی کتاب تم کو کافی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ سمجھا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں کوئی ایسی نئی بات لکھانے والے ہیں جو پہلے سے کتاب و شریعت میں نہیں آئی ہے تو آیہ کریمہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کا جھٹلانا لازم آتا ہے اور یہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے، لہٰذا حضور کا مقصد یہ ہے کہ ان احکام کی تاکید فرمائیں جو پہلے مقرر فرما چکے ہیں تو شدت مرض میں حضور کو مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں، بہتر ہے کہ وہ آرام فرمائیں ﷺ، ہم کو خدائے تعالیٰ کی کتاب اور اس کی تاکید کافی ہے۔ اور اس بات پر حدیث شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ گواہ ہے کہ

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قد غلب علیہ الوجع و عندکم القران حسبکم کتاب اللّٰہ۔

بے شک رسول اللہ ﷺ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے،

وہی اللہ کی کتاب تم کو کافی ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ انہوں نے حضور کی بات رد کر دی، انتہائی نادانی و جہالت اور بغض و عداوت ہے کہ اس قسم کی مصلحت آمیز باتیں اور مشورے حضور و صحابہ کے درمیان اکثر ہوا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس خصوص میں سب سے زیادہ ممتاز تھے کہ منافقوں پر نماز پڑھنے، ازواجِ مطہرات کو پردہ نشین کرنے، جنگ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے، مقام ابراہیم کو مصلّٰی ٹھہرانے اور بشر منافق کے قتل وغیرہ بہت سے معاملات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عرض و مشورے کے مطابق وحی نازل ہوئی اور اکثر واقعات میں ان کی بات اللہ و رسول کی بارگاہ میں مقبول ہوئی، اور اگر اس قسم کی مصلحت آمیز باتوں کے پیش کرنے کو حضور کی بات کا رد کرنا یا وحی کا ٹھکرانا قرار دیا جائے، جیسا کہ رافضی لوگ کرتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی کئی معاملہ میں حضور کی بات کا رد کرنا یا وحی کے ٹھکرانے کا الزام عائد ہو جائے گا:

اول یہ کہ بخاری شریف میں متعدد طریقے سے مروی ہے کہ سرکار اقدس ﷺ حضرت علی و حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مکان پر رات کے وقت تشریف لے گئے، ان کو خواب گاہ سے اٹھایا اور نماز تہجد ادا کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

قوما فصليا۔

یعنی تم دونوں اٹھ کر نماز پڑھو!

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

واللّٰه لا نصلی الا ما کتب اللّٰه لنا۔

یعنی خدا کی قسم ہم فرض نماز سے زیادہ نہیں پڑھیں گے۔

تو حضور ﷺ ان کے گھر سے واپس ہو گئے اور فرمایا:

و کان الانسان اکثر شیء جدلا۔

اور آدمی ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔ (پارہ۱۵ع ۲۰)

کیا اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وحی کا ٹھکرانے والا کہا جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ان کی ملامت نہ فرمائی۔

دوسرے یہ کہ صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو صلح نامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور کافروں کے درمیان لکھا جا رہا تھا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور کے نام کے ساتھ لفظ ''رسول اللہ'' لکھا، تو مشرکین مکہ نے اس لفظ کے لکھنے پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہم اگر رسول اللہ مانتے تو پھر آپ سے کیوں لڑتے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا:

امح رسول اللہ۔

یعنی رسول اللہ کا لفظ مٹا دو!

تو حضرت علی نے کہا: قسم خدا کی ہم ہرگز نہیں مٹائیں گے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ ان کے ہاتھ سے لے کر خود مٹایا۔

کیا اس واقعہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور کی بات رد کرنے والا اور وحی کا ٹھکرانے والا قرار دیا جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ حد درجہ ان کو حضور سے محبت کرنے والا قرار دیا جائے گا، تو پھر از راہِ محبت حضرت عمر رضی اللہ عنہ درد کی شدت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مشقت میں پڑنا گوارا نہ فرمایا، تو ان کو وحی کا ٹھکرانے والا کیوں قرار دیا جائے گا؟

اگر رافضی ایسی باتوں کو بھی پیغمبر کے قول کا رد کرنا اور وحی کا ٹھکرانا کہیں گے تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماریں گے، اس لئے کہ رافضی کی معتبر کتابوں میں بھی اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل

نہیں کیا، جیسا کہ شریف مرتضٰی نے جس کا لقب امامیہ کے نزدیک ''علم الهدیٰ'' ہے، اپنی کتاب ''درر غرر'' میں محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی اور انہوں نے اپنے باپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی، انہوں نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ماں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی تہمت کے بارے میں لوگوں نے بہت باتیں کیں، اس لئے کہ ان کا چچازاد بھائی ان سے کبھی کبھی ملنے کے لئے آیا کرتا تھا تو حضور نے حضرت علی سے فرمایا:

خذ هذا السيف و انطلق فان وجدت عندها فاقتله۔

یعنی اس تلوار کو لے کر جاؤ اور ماریہ کے پاس اگر اس مرد کو پاؤ تو قتل کر دو!

حضرت علی فرماتے ہیں کہ میں حضور کے حکم کے مطابق اس مرد کی طرف متوجہ ہوا، تو اس نے جان لیا کہ میں اس کا قصد رکھتا ہوں تو وہ میرے پاس آ کر کھجور کے درخت پر چڑھتے ہوئے اپنے آپ کو پیٹھ کے بل گرا دیا اور دونوں پاؤں کو اٹھا دیا، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجبوب ہے یعنی **مقطوع الذکر و الخصیتین** ہے، اس کے پاس مردوں کے جیسا کچھ نہیں ہے، تو میں نے اپنی تلوار میان میں کر لی اور واپس آ کر حضور سے اس کا سارا حال بیان کیا، تو حضور نے فرمایا:

الحمد لله الذی یصرف عنا الرجس اهل البیت۔

خدائے پاک کا شکر ہے کہ وہ ہمارے جملہ اہل بیت کو گندگی سے بچاتا ہے۔

اور محمد بن بابویہ نے امالی میں و دیلمی نے ''ارشاد القلوب'' میں روایت کی ہے:

ان رسول الله صلی الله علیه و سلم اعطی فاطمة سبعة دراهم و قال: اعطیها علیا و مریه ان یشتری لاهل بیته طعاما فقد غلبهم الجوع فاعطتها علیا و قالت ان رسول الله

صلی اللّٰہ علیہ و سلم امرك ان تبتاع لنا طعاما فاخذها علی و خرج من بیته لیبتاع طعاما لاهل بیته فسمع رجلا یقول: من یقرض الملی الوفی فاعطاه الدراهم۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو سات درہم عطا فرمایا کہ اور حکم دیا کہ یہ درہم علی کو دے کر کہہ دو کہ وہ اپنے اہل بیت کے واسطے کھانا خرید لائیں کہ ان پر بھوک غالب ہو رہی ہے، تو حضرت فاطمہ نے وہ درم علی کو دیا اور کہا: بے شک حضور نے حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے واسطے کھانا خرید لائیں، تو حضرت علی وہ درم لے کر اپنے اہل بیت کے واسطے کھانا خریدنے کے لئے گھر سے نکلے، راستہ میں سنا، ایک شخص کہتا ہے کہ کون ایسا آدمی ہے جو سچے وعدہ پر ہم کو قرض دے؟ تو حضرت علی نے وہ درم اس کو دے دیے۔

اس واقعہ میں حضور کے حکم کی مخالفت بھی ہے اور غیر کے مال میں بلا اجازت تصرف بھی اور اپنے اہل وعیال کے حق کا تلف کرنا بھی اور حضور کی اولاد کو بھوکا رکھ کر ان کو تکلیف پہنچانا بھی، مگر یہ سب انہوں نے اللہ واسطے کیا اور ایثار کیا جو قابل تعریف و تحسین ہے، حضور کے حکم کا رد کرنا اور وحی کا ٹھکرانا نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ ہمارے اس فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین سبھی راضی ہوں گے رضی اللہ عنہم۔

ان تمام واقعات سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی الٰہی نہیں ہے، ورنہ لفظ رسول اللہ کے مٹانے، قبطی مرد کے قتل کرنے، کھانا خریدنے اور تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم سب وحی الٰہی ہوتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وحی الٰہی کے ٹھکرانے کا الزام عائد ہوتا۔

اور جنگ تبوک کے موقع پر جبکہ حضور نے حضرت علی کو اہل و عیال میں رہنے کا حکم دیا تو ان کا یہ کہنا ہرگز نہ ہوتا:

اتخلفنی فی النساء و الصبیان۔

یعنی کیا آپ ہم کو عورتوں اور بچوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔

بلکہ ہم یہاں تک کہتے ہیں کہ رافضی سنی دونوں کے نزدیک حکم الٰہی کے خلاف مصلحت کو پیش کرنا اور مشقت کو ٹالنے کے لئے بار بار اصرار کرنا بھی وحی الٰہی کو ٹھکرانا نہیں، جیسا کہ سرکار اقدس ﷺ شب معراج حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے نو بار خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ لوٹ کر گئے اور عرض کیا: یا الٰہ العالمین! میری امت اتنی نمازوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے گی۔ اگر — معاذ اللہ رب العالمین — یہ وحی کا رد کرنا اور ٹھکرانا ہوتا تو سید الانبیا سرکار مصطفیٰ ﷺ سے اس کا صدور ہرگز نہ ہوتا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسا مشورہ دیتے۔

اور قرآن مجید سورۂ شعرا میں ہے:

و اذ نادیٰ ربك موسیٰ ان ائت القوم الظالمین قوم فرعون الا یتقون قال رب انی اخاف ان یکذبون و یضیق صدری و لا ینطلق لسانی فارسل الیٰ هارون و لهم علی ذنب فاخاف ان یقتلون قال کلا فاذهبا بایٰتنا انا معکم مستمعون۔

(پارہ۱۹ع٦)

اور یاد کرو! جب تمہارے رب نے موسیٰ کو ندا فرمائی کہ ظالم لوگوں کے پاس جاؤ جو فرعون کی قوم ہے، کیا وہ نہیں ڈریں گے؟ عرض کیا: اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اور میرا سینہ تنگی کرتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی، لہٰذا تو ہارون کو بھی رسول کر اور اس قوم کا مجھ

پر ایک الزام ہے، تو میں ڈرتا ہوں کہیں مجھ کو قتل کر دیں۔ فرمایا: یوں نہیں، تم دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ، بے شک ہم تمہارے ساتھ سننے والے ہیں۔

ان آیات مبارکہ سے بھی واضح ہو گیا کہ خدائے تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں مصلحت کو پیش کرنا وحی الٰہی کا رد نہیں ہے، ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں ہرگز اس کے مرتکب نہ ہوتے۔

اور پھر رافضی، سنی دونوں کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ اللہ و رسول کا ہر حکم وجوب کا مقتضی نہیں ہوتا بلکہ مستحب ہونے کا بھی احتمال رکھتا ہے، جیسا کہ سنیوں کی کتاب ''نور الانوار'' اور رافضیوں کی کتاب ''درر غرر'' میں مذکور ہے۔ لہٰذا جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض حکم کو مستحب سمجھ کر اس پر عمل نہ کیا اور موردِ الزام نہ ہوئے اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حضور کے حکم کو مستحب ٹھہرا کر درد کی شدت میں آپ کو مشقت میں ڈالنا ضروری نہ سمجھا تو وہ بھی مورد الزام نہ ہوئے۔ **و هو تعالیٰ اعلم۔**

۲- حضور کی طرف حضرت عمر نے ہذیان کی نسبت نہیں کی

صلی اللہ علیہ وسلم و رضی اللہ عنہ

اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہذیان کی نسبت کی ہے۔ اس لئے کہ حدیث شریف کا یہ جملہ **اهجر استفهموه** (کیا حضور نے پریشان بات کہی ان سے پوچھو!) حضرت عمر ہی نے کہا' یقین کے ساتھ ہرگز ثابت نہیں کہ بخاری و مسلم وغیرہ کی اکثر روایتوں میں یوں ہے:

قالوا ما شانه اهجر استفهموه۔

لوگوں نے کہا: حضور کا کیا حال ہے، کیا انہوں نے پریشان بات کہی، ان سے پھر پوچھو۔

مطلب یہ ہے کہ ہجر کے معنی پریشان وہذیان اور بے ہودہ بکنے کے بھی ہیں، یہ تو تسلیم ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ کلام میں استفہام انکاری ہو، جیسے پارہ اول رکوع دوم میں ہے کہ منافقوں نے کہا:

انؤمن کما امن السفهاء؟

یعنی کیا ہم ایمان لائیں جیسے کہ بے وقوف لوگ ایمان لائے؟ یعنی ہم ایمان نہیں لائیں گے۔

تو اسی طرح جو لوگ لکھنے کا سامان لانے کی تائید میں تھے ہوسکتا ہے انہی لوگوں نے کہا ہو: **اهجر استفهموه**. کیا حضور نے ہجر کیا یعنی ہذیان نہیں کیا ہے لکھنے کا سامان لانا چاہیے ان سے پھر پوچھو!

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو لوگ لکھنے کا سامان لانے کے مخالف تھے انہی لوگوں نے استفہام انکاری کے طور پر کہا ہو: **اهجر استفهموه** یعنی حضور کو ہذیان تو ہوا نہیں، اس لئے کہ نبی اس سے محفوظ ہوتے ہیں، تو آپ کا کلام ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کون سی ایسی ضروری چیز ہے جسے حضور شدت درد میں لکھنا چاہتے ہیں، پھر سے پوچھو۔

اور نہ سمجھنے کی وجہ بالکل ظاہر تھی اس لئے کہ حضور ﷺ کی عادت کریمہ تھی کہ احکام کو خدائے تعالیٰ کی طرف منسوب فرماتے تھے اور اس موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ **ان اللّٰه امرنی ان اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی**۔ بے شک اللہ نے مجھ کو فرمایا ہے کہ میں تم لوگوں کے لئے ایک کتاب لکھ دوں تا کہ تم گمراہ نہ ہو۔

لہٰذا جو لوگ لکھنے کا سامان نہ لانے کی تائید میں تھے ان کو شبہہ پیدا ہوا کہ حضور نے تو عادت کے مطابق ہی فرمایا ہوگا، مگر ہم نہیں سمجھے، پھر سے پوچھو۔

اور صحابہ کرام خوب جانتے تھے کہ حضور ﷺ دفع تہمت کے لئے کبھی لکھتے نہ

تھے۔قرآن مجید پارہ ۲۱ رکوع ۱ میں ہے:

و ما كنت تتلو من قبله من كتاب و لا تخطه بيمينك۔

اس سے پہلے تم کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔

مگر اس موقع پر حضور نے خود لکھنے کو فرمایا، اس لئے صحابہ کو دوبارہ سمجھنے کی ضرورت پیش آئی۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ **هَجَرَ هَجَرْ و هجران** سے مشتق ہو، جس کے معنی چھوڑنے کے ہیں اور لفظ **الحياة** مفعول مقدر ہو، تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کیا حضور نے ظاہری زندگی چھوڑ دی؟ معلوم کرو! جیسا کہ قرآن مجید میں یہ لفظ متعدد جگہ چھوڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً پارہ ۱۶ رکوع ۶ میں ہے:

و اهجرني مليا۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا آزر نے ان سے کہا کہ تم مجھے زمانہ دراز تک چھوڑ دو!

اور سورہ مزمل میں ہے:

و اهجرهم هجرا جميلا۔

یعنی انہیں اچھی طرح چھوڑ دو۔

اور بعض روایتوں میں جو ہمزۂ استفہام نہیں ہے تو مقدر ہے، جیسے پارہ ۷ ع ۱۵ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول: **هذا ربی** کے شروع میں بہت سے مفسرین کے نزدیک ہمزۂ استفہام مقدر ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی بخاری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

اگر در بعضے روایات حرف استفہام مذکور نباشد مقدر ست۔

اگر بعض روایتوں میں حرف استفہام مذکور نہیں ہے تو مقدر ہے۔

(اشعۃ اللمعات جلد ۴ ص ۶۱۰)

اور اگر ہجر کے معنی اختلاطِ کلام ہی کے لئے جائیں تو اس کی دو قسمیں ہیں:
ایک وہ اختلاط جو بالاتفاق انبیائے کرام کو ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قوت گویائی کے اعضا کمزور ہو جائیں یا آواز بیٹھ جائے یا زبان پر خشکی کا غلبہ ہو جن کے سبب الفاظ اچھی طرح سننے میں نہ آئیں، تو یہ حالتیں انبیا کو لاحق ہو سکتی ہیں، جیسا کہ حدیث شریف کی صحیح کتابوں میں موجود ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو آخری بیماری میں آواز بیٹھنے کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

اور اختلاطِ کلام کی دوسری قسم کا عارضہ غشی کے سبب یا دماغ پر بخارات کے چڑھ جانے سے سخت بخار میں ہوتا ہے کہ اکثر اس حالت میں مقصد کے خلاف کلام زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

اختلاط کلام کی یہ قسم انبیا کو ہو سکتی ہے یا نہیں؟ علما کو اس میں اختلاف ہے، جو لوگ اسے جنون کی قسم قرار دیتے ہیں وہ انبیائے کرام کے لیے اسے جائز نہیں ٹھہراتے۔ اور بعض لوگ اسے غشی و بے ہوشی کے مثل قرار دیتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس طرح کا عارضہ لاحق ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے، جیسا کہ پارہ ۹ رکوع ۷ میں ہے:

و خر موسٰی صعقا۔
یعنی موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اور پارہ ۲۴ ع ۲ میں ہے:

و نفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت و من فی الارض الا من شاء اللّٰہ ثم نفخ فیہ اخرٰی فاذا ھم قیام ینظرون۔

اور صور پھونکا جائے گا تو جسے اللہ چاہے گا اس کے علاوہ جتنے زمین جو آسمان میں ہیں سب بے ہوش ہو جائیں گے پھر صور دوبارہ پھونکا جائے

گا تو وہ سب دیکھتے ہوئے کھڑے ہو جائیں گے۔
اور صحیح حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

فاکون اول من یفیق فاذا موسٰی اخذ بقائمة من قوائم العرش۔
تو پہلے جس کو ہوش ہوگا وہ میں ہوں گا اور موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ وہ عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں۔

ثابت ہوا کہ انبیائے کرام پر غشی و بے ہوشی طاری ہوتی ہے اور یہ ان کی شان کے خلاف نہیں۔ اور خوب ظاہر ہے کہ اس حالت کو جنون پر قیاس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ جنون میں پہلے قوائے مدرکہ کی روح میں خلل واقع ہوتا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے، لیکن اس حالت میں روح کے اندر ہرگز خلل نہیں ہوتا، بلکہ کچھ وقت کے لئے جسم کے صرف اعضا مرض کے سبب قابو میں نہیں رہتے، مگر خدائے تعالیٰ اپنے انبیائے کرام کو اس حالت میں بھی اپنی مرضی کے خلاف کچھ کرنے اور کہنے سے بچائے رکھتا ہے۔

لہٰذا اگر بعض حاضرین کو وہم پیدا ہو کہ حضور کا حکم اختلاط کلام کی قسم سے ہے جو ایسے مرضوں میں ظاہر ہوتا ہے تو کچھ بعید بھی نہیں کہ دردِ سر کی شدت کے ساتھ اس وقت حضور پر بخار بھی بہت زور کئے ہوئے تھا، مگر اس کے باوجود کہنے والے نے بلحاظ ادب قطعی طور پر بات نہ کہی، بلکہ بطریق تردد کہا: **ما شانه اهجر استفهموه۔ یعنی** ان کا کیا حال ہے، کیا اختلاط کلام ہوا ہے یا ہم سمجھے نہیں، دوبارہ پوچھو! واضح فرمائیں اگر حکم ہو لکھنے کا سامان لائیں ورنہ جانے دیں کہ درد کی شدت میں مشقت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اور یہ سب باتیں اس صورت پر ہیں جبکہ اختلاط کلام سے آخری قسم مراد ہو اور اگر قسم اول مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ اس مضمون کو ہم حضور کی عادت کے خلاف دیکھتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ کی قوت گویائی میں کمزوری پیدا ہو گئی ہو اس سبب سے ہم آپ

کے کلام کو بخوبی نہیں سمجھ سکے، لہٰذا دوبارہ پوچھو تا کہ ظاہر فرمائیں اور ہم یقین کے ساتھ جان لیں کہ حضور لکھنے کا سامان طلب فرمارہے ہیں تو ہم اسے حاضر کریں۔ اور اس صورت میں بھی کسی پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ **و ھو سبحانہ و تعالٰی اعلم۔**

۳۔ حضور کی آواز پر کسی نے آواز اونچی نہیں کی

بے شک سید عالم ﷺ کی آواز پر آواز کو اونچی کرنا سب نیکیوں کو برباد کرنا ہے اور حضور کی آواز پر آواز کو بلند کرنا سخت گناہ ہے۔ مگر اس واقعہ میں کسی نے ایسا نہیں کیا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور نہ کسی دوسرے صحابی نے۔ البتہ آپس کی گفتگو میں حضور کے سامنے ان لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ صحابہ کرام آپس کی بحثوں اور جھگڑوں میں حضور کے سامنے ایک دوسرے پر آوازیں بلند کرتے تھے، نعرے لگاتے تھے اور حضور منع نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس قسم کی بحثوں کے جائز ہونے کا قرآن کریم سے بھی دو طرح اشارہ ملتا ہے:

اول یہ کہ قرآن کریم نے ان لفظوں کے ساتھ حضور کے سامنے آواز بلند کرنے کو منع فرمایا ہے:

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی۔

نبی کی آواز پر اپنی آواز کو بلند نہ کرو! (پ۲۶ ع۱۳)

اور اس طرح منع نہیں فرمایا: **لا ترفعوا اصواتکم بینکم عند النبی۔** نبی کے پاس اپنی آوازوں کو آپس میں بلند نہ کرو!

معلوم ہوا کہ حضور کی آواز پر آواز بلند کرنا منع ہے، مگر حضور کے سامنے آپس میں ایک دوسرے پر آواز بلند کرنا جائز ہے۔

دوسرے قرآن مجید نے یہ فرمایا:

کجھر بعضکم لبعض۔

یعنی جس طرح کہ ایک دوسرے پر آواز بلند کرتے ہو۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کا ایک دوسرے پر آواز بلند کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ حضور کی آواز پر آواز بلند کرنا بربادیِ اعمال کا سبب ہے اور پھر یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کی؟ پہلے ان کا آواز بلند کرنا ثابت کیا جائے پھر اعتراض کیا جائے، بہت ممکن ہے کہ مجموعی طور پر ایسا ہوا ہو، اس لئے کہ جب بہت سے صحابہ حجرۂ مبارکہ میں حاضر تھے تو سب کی گفتگو سے آواز بلند ہونا یقینی ہے اور یہ گناہ نہیں اور یہ بھی گناہ ہو تو سب حاضرین یہاں تک کہ حضرت عباس و حضرت علی رضی اللہ عنہما پر بھی یہ گناہ عائد ہو گا۔ اور حضور کا ارشاد گرامی لا ینبغی عندی تنازع یعنی میرے پاس جھگڑنا مناسب نہیں، اسی بات کی تائید کر رہا ہے کہ یہ گناہ نہیں بلکہ خلاف اولیٰ ہے، اس لئے کہ زنا جو بربادیِ اعمال کا سبب نہیں ہے اس سے منع کرنے لئے بھی یوں نہیں کہا جاتا کہ زنا مناسب نہیں ہے۔

اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوموا عنی۔ یعنی تم لوگ میرے پاس سے اٹھ جاؤ!

تو یہ کلام ان اقسام میں سے ہے جو مرض کے سبب مریض سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذرا سی گفت و شنید کو برداشت نہیں کرتا اور پھر یہ خطاب تو سب حاضرین سے تھا جس میں لکھنے کا سامان لانے کی تائید کرنے والے اور مخالفت کرنے والے دونوں شامل تھے، تو صرف حضرت عمر ہی پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے، حضرت عباس و حضرت علی اور دوسرے لوگوں پر کیوں نہیں کیا جاتا؟

۴۔ مسلمانوں کی حق تلفی نہیں ہوئی

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ لکھنے کا سامان نہ دینے کے سبب مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی، اس لئے کہ حق تلفی اس صورت میں ہوتی جبکہ خدائے تعالیٰ کی جانب سے کوئی نئی بات

آئی ہوتی اور امت کے لئے نفع بخش ہوتی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی۔ (پارہ ۶ رکوع ۵)

یہ آیت کریمہ جو تقریباً تین ماہ پہلے نازل ہو چکی تھی اس سے قطعی طور پر معلوم ہوا کہ کوئی نیا حکم نہیں تھا، بلکہ کوئی امر دینی بھی نہیں تھا، بلکہ صرف ملکی مصلحتوں کا ارشاد اور نیک مشورہ تھا کہ وہ وقت اسی قسم کی وصیتوں کا تھا، کوئی عقل منداسے ہرگز نہیں مان سکتا کہ تیئیس برس کی مدت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری نبوت کا زمانہ تھا اور آپ اپنی امت پر بے حد مہربان تھے اس مدت میں پورا قرآن ان کو پڑھایا اور بے شمار حدیثیں ارشاد فرمائیں، مگر ایک اہم بات کہنے سے رہ گئی تھی جو اختلاف دفع کرنے کے لئے تریاق مجرب تھی، حضور اسے لکھتے یا لکھاتے مگر حضرت عمر کے ڈر سے اسے نہیں لکھایا اور اہل بیت کی ہر وقت آمد و رفت رہتی تھی مگر ان سے زبانی بھی نہیں فرمایا، جبکہ حضرت عمر وہاں ہر وقت موجود بھی نہیں رہتے تھے۔ **ھٰذا بھتان عظیم۔**

ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بہت بڑا بہتان ہے اور اس بے ہودہ خیال کے باطل ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریر لکھنے کا حکم اگر خدائے تعالیٰ کی طرف سے قطعی تھا تو جمعرات سے دوشنبہ پیر تک نہ لکھنے کے سبب حضور پر تساہلی کا الزام عائد ہوتا ہے جو شان رسالت کے سراسر خلاف اور باطل ہے۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك و ان لم تفعل فما بلغت رسالته و اللّٰه یعصمك من الناس۔

اے رسول! تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل کیا گیا ہے تو اسے پہنچا دے، اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام تو نے پہنچایا ہی نہیں۔

اور اللہ لوگوں کے شر سے تجھ کو محفوظ رکھے گا۔ (پ۶، ع۱۴)

کیا اس آیت کریمہ کے ہوتے ہوئے جبکہ ظاہری حیات کے آخری ایام تھے حضور حضرت عمر سے ڈر گئے اور خدائے تعالیٰ کے وعدہ پر کہ وہ لوگوں کے شر سے آپ کو محفوظ رکھے گا، حضور نے یقین نہ کیا؟ **معاذ اللّٰہ من ذالک۔**

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم نہیں تھا بلکہ آپ اپنی طرف سے لکھوانا چاہتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا کہ نہیں؟ اگر جواب دیا جائے کہ رجوع فرمالیا تو اس صورت میں سارا اعتراض ہی ختم ہو گیا اور اس واقعہ نے بھی موافقاتِ عمری میں سے ہو کر ان کی عزت کو اور چار چاند لگا دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ حضور نے رجوع نہیں فرمایا تو امت کی نفع بخش چیز کا چھوڑ دینا حضور پر لازم آیا اور یہ باطل ہے۔ اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رءوف رحیم۔

بے شک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر بڑے ہی شفیق و مہربان۔ (پ۱۱، ع۵)

اور دوسری دلیل اس خیال کے باطل ہونے پر یہ ہے کہ جو بات آپ لکھنا چاہتے تھے وہ یا تو کوئی نئی بات تھی جو تبلیغ سابق پر زائد تھی یا تبلیغ سابق کو منسوخ کرنے والی اور اس کے مخالف تھی اور یا تبلیغ سابق کی تاکید تھی۔ پہلی اور دوسری صورت باطل ہے، اس لیے کہ آیت کریمہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کی تکذیب لازم آتی، اور تیسری صورت میں امت کی کوئی حق تلفی نہ ہوئی، اس لئے کہ حضور ﷺ کی تاکید خدائے تعالیٰ کی تاکید سے بڑھ کر نہیں ہے۔ تو جن لوگوں کو خدائے تعالیٰ کی تاکید کا لحاظ نہیں ہوگا

ان کو حضور کی تاکید سے بھی کچھ فائدہ نہ پہنچے گا۔

اور حدیث شریف سے اس بے ہودہ خیال کے باطل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو ابتدائے جواب میں لکھی گئی ہے اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بولنے سے پہلے حاضرین نے آپس میں جھگڑا کیا اور جو کچھ کہنا تھا کہا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دوبارہ پوچھا، مگر حضور نے قلم و دوات منگانے اور لکھنے لکھانے سے خاموشی اختیار فرمائی۔ اگر یہ بات قطعی ہوتی تو آپ ہرگز خاموش نہ ہو جاتے اور اگر اس وقت خاموش ہو گئے تھے تو اس کے بعد پانچ روز ظاہری حیات کے ساتھ موجود رہے جس کا اقرار رافضی لوگوں کو بھی ہے تو اس دُرمیان میں اسے ضرور لکھا دیتے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ دینی معاملات میں سے کسی چیز کا لکھنا منظور نہ تھا بلکہ دنیوی معاملات میں کچھ کہنا تھا جس کی وصیت فرمائی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور ایلچیوں کی خاطر مدارات کرو اور تیسری چیز کہ جس سے اس حدیث شریف میں سکوت کا ذکر ہے غالباً حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی درستگی ہے، جیسا کہ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور اس بات پر کہ وہ دینی معاملہ نہ تھا دلیل یہ ہے کہ جب دوسری بار صحابہ کرام نے قلم دوات وغیرہ لانے کے بارے پوچھا تو حضور نے فرمایا:

ذرونی فالذی انا فیه خیر مما دعوتنی الیه۔

مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو کہ میں اپنے باطن سے مشاہدۂ حق میں مشغول ہوں اور یہ حالت اس سے بہتر ہے کہ جس کی طرف تم بلا رہے ہو۔

اگر کوئی دینی معاملہ یا تبلیغ کا پہنچانا منظور ہوتا تو بہتری کا معنی کیسے درست ہوتا؟ اس لئے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیائے کرام کے حق میں وحی پہنچانے اور

دینی احکام جاری کرنے سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

اور اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جب سرکار اقدس ﷺ نے دوسری بار اس عالم سے بے تعلقی کا جواب ارشاد فرمایا تو حاضرین کو حسرت و یاس دامن گیر ہوئی اور ناامید ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا:

عندکم القرآن حسبکم کتاب اللّٰہ۔

مطلب یہ ہوا کہ حضور کے اس جواب سے تم لوگ مایوس نہ ہو، تمہاری تعلیم اور تمہارے دین وایمان کی حفاظت کے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کلام اس گفتگو کے بعد صحابہ کرام کی تسلی کے لئے فرمایا، نہ کہ تحریر سے منع کرنے لئے۔

اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس واقعہ کے وقت حاضر تھے، اس پر رافضی سنی دونوں کا اتفاق ہے، مگر حضرت عمر پر یا حاضرین مجلس میں سے کسی پر کہ جن لوگوں نے تحریر کی مخالفت کی تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی پر انکار یا افسوس ہرگز منقول نہیں، نہ آپ کے زمانۂ خلافت میں، نہ آپ کی پوری زندگی میں اور نہ آپ کی وفات کے بعد، نہ کسی شیعہ سے اور نہ کسی سنی سے۔ لہٰذا اگر حضرت عمر اس معاملہ میں خطاوار ہیں تو حضرت علی بھی اس کام کی تائید میں ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کے علاوہ کہ جو اس وقت کم سن تھے کسی کا افسوس اور کسی کی حسرت کسی پر ہرگز منقول نہیں ہوئی، اگر کوئی بہت بڑی چیز فوت ہوگئی ہوتی تو بڑے بڑے صحابہ اور کم از کم حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر یقیناً حسرت و افسوس ظاہر کرتے اور تحریر سے روکنے والوں کی شکایت زبان پر ضرور لاتے۔

اور اگر کسی کو شبہہ ہو کہ جب کسی اہم بات کا لکھنا منظور نہ تھا تو حضور نے یہ کیوں فرمایا: لن تضلوا بعدی۔ یعنی تاکہ میرے بعد تم گمراہ نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ دین کے بارے میں کوئی اہم بات تھی اس لئے کہ دین میں خلل پڑنا ہی گمراہی کے معنی ہیں۔

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ ضلال عرب کی بولی میں جیسا کہ دین کی گمراہی کے معنی میں آتا ہے دنیا کے معاملات میں بدتدبیری کے معنی میں بھی بہت بولا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قول حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں منقول ہے:

ان ابانا لفی ضلال مبین۔

یعنی بے شک ہمارے باپ صریح غلطی پر ہیں۔ (پارہ ۱۲، رکوع ۱۲)

اور اسی سورۃ یوسف میں دوسری جگہ ہے:

انك لفی ضلالك القدیم۔

یعنی بے شک آپ اپنی اسی پرانی غلطی پر ہیں۔ (پارہ ۱۳، رکوع ۵)

ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کافر نہ تھے کہ اپنے باپ یعقوب علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو گمراہ سمجھتے۔ معاذ اللہ۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ دنیوی معاملات میں آپ بے تدبیری برتتے ہیں کہ ہم لوگوں سے جو ہر طرح کی خدمتیں کرتے ہیں الفت کم رکھتے ہیں اور جو لوگ چھوٹے ہیں اور خدمت کرنے میں قاصر ہیں ان سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

لہٰذا اسی طرح یہاں بھی ''تضلو'' سے مراد ملک کی تدبیر میں خطا ہے نہ کہ دین کی گمراہی۔ اور واضح دلیل اس پر یہ ہے کہ ۲۳ برس کی مدت میں قرآن کا نزول اور احادیث کریمہ کا ارشاد ان کی گمراہی کے دفع کرنے کے لیے اگر کافی نہ ہو تو چند سطروں کی تحریر اس کام کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اور بعض لوگوں کے دل میں یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت کا معاملہ لکھنا چاہتے تھے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روک دینے سے یہ اہم معاملہ رہ گیا۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ خلافت کا معاملہ لکھنا ہرگز منظور نہ تھا، اس لئے کہ حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق حضور نے اسی مرض میں ارادہ فرمایا تھا، جیسا کہ مسلم شریف جلد۲ ص ۲۷۳ میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

ادعی لی ابا بکر اباك و اخاك حتی اکتب لهما کتابا فانی اخاف ان یتمنّٰی متمن و یقول قائل انا اولٰی و یابی اللّٰه و المؤ منون الا ابا بکر۔

اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ان کے لئے وصیت نامہ لکھ دوں، اس لئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ کوئی آرزو کرنے والا آرزو کرے یا کوئی کہنے والا کہے کہ میں افضل ہوں حالانکہ خدا اور مومنین علاوہ ابو بکر کے کسی کو قبول نہ کریں گے۔

مگر ایسا ارادہ فرمانے کے بعد پھر حضرت عمر یا کسی دوسرے کی ممانعت کے بغیر حضور نے خود بخود لکھنا موقوف کر دیا۔

اور پھر اگر خلافت کے لئے وصیت ہی کرنی تھی تو اس کے لئے لکھنا ضروری نہ تھا بلکہ جو لوگ حجرۂ مبارکہ میں موجود تھے ان کے سامنے زبانی وصیت کر دینا ہی کافی تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی نے لکھنے سے منع نہیں کیا اور اگر منع کرنا فرض بھی کر لیا جائے تو اس سے امت کی کوئی حق تلفی ہرگز نہیں ہوئی۔ یہ رافضیوں کا وسوسہ ہے اور وسوسہ کا کوئی علاج نہیں۔

هذا ما ظهر لی و هو تعالٰی و رسوله الاعلٰی اعلم جل جلاله و صلی اللّٰه علیه و سلم۔

کتبه

جلال الدین احمد الامجدی

۴؍ربیع الآخر ۱۴۰۱ھ

سابق فتویٰ پر ایک شبہہ اور اس کا جواب

مسئلہ

از

حیات علی بھاؤپوری، بھاؤپور، ضلع بستی

مکرمی حضرت مفتی صاحب قبلہ دام الطافکم!

السلام علیکم!

اِلتماس ایں کہ حدیث قرطاس کے بارے میں آپ کے فتویٰ کا مطالعہ کیا، بجز عبارت ذیل کے آپ نے بہت خوب تحریر فرمایا ہے، وہ عبارت یہ ہے کہ "محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام وحی الٰہی نہیں ہے" تو یہ نص صریح و ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے بارے میں اطمینان بخش مدلل جواب تحریر فرمائیں! فقط

الجواب

باسمہ تعالٰی و الصلاۃ و السلام علٰی رسولہ الاعلٰی۔
محترم المقام زید احترامکم!
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!
ثم السلام علیکم!
محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام وحی خدا نہیں ہے۔ یہ بات نص صریح کے خلاف نہیں، اس لئے کہ آیت کریمہ **و ما ینطق عن الھوٰی ان ھو الا وحی یوحٰی** میں **ھو** کا مرجع قرآن عظیم ہے، جیسا کہ تفسیر کبیر میں ہے کہ

انہ ضمیر معلوم و ھو القرآن کانہ یقول ما القرآن الا وحی۔

یعنی آیت کریمہ **ان ھو الا وحی یوحٰی** میں **ھو** ضمیر کا مرجع قرآن ہے، گویا کہ خدائے تعالٰی فرماتا ہے کہ قرآن صرف وحی ہے۔
اور تفسیر روح البیان میں ہے:

ان ھو ای ما الذی ینطق بہ من القرآن الا وحی من اللہ تعالٰی یوحی الیہ بواسطۃ جبرئیل علیہ السلام۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب وحی کیا جاتا ہے۔

اور مدارک میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے:

و ما اتاکم به من القرآن لیس بمنطق یصدر عن هواه و رایه انما هو وحی من عند الله یوحی الیه۔

یعنی جو قرآن کہ رسول تمہارے پاس لائے ہیں وہ ایسا کلام نہیں ہے جو ان کی خواہش اور رائے سے ہو، وہ صرف وحی الٰہی ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

اور تفسیر ابوالسعود میں ہے:

ان هو ای ما الذی ینطق به من القرآن الا وحی من الله تعالٰی۔

اِس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے رسول قرآن بتاتے ہیں وہ صرف وحی الٰہی ہے۔

اور تفسیر خازن میں ہے:

و ما ینطق عن الهوٰی ای بالهوٰی و المعنٰی لا یتکلم بالباطل و ذالك انهم قالوا ان محمدا یقول القرآن من تلقاء نفسه ان هو ای ما هو یعنی القرآن و قیل نطقه فی الدین الا وحی من الله یوحی الیه۔

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ کفار و مشرکین کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن اپنی طرف سے کہتے ہیں، اس لئے آیت کریمہ کا یہ معنی ہوا کہ وہ باطل کلام نہیں فرماتے ہیں۔ قرآن اور بعض لوگوں نے کہا کہ ان کا ہر وہ کلام جو دین کے بارے میں ہو صرف وحی الٰہی ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

اور معالم التنزیل میں **و ما ینطق عن الهوٰی** کی تفسیر خازن کی مثل لکھنے کے بعد تحریر فرمایا:

ان هو ما نطقه فی الدین و قیل القرآن۔

یعنی دین کے بارے میں رسول کا کلام اور بعض لوگوں نے کہا کہ قرآن صرف وحی خداوندی ہے جو رسول کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔

ان معتبر تفسیروں سے واضح ہوگیا کہ آیت کریمہ **ان هو الا وحی یوحٰی** میں **هو** کا مرجع قرآن عظیم ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن وحی الٰہی ہے نہ کہ ہر کلام۔

اور تفسیر معالم التنزیل میں جو **هو** کا مرجع **نطقه فی الدین** بتایا تو اس سے بھی ہر کلام کا وحی الٰہی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف دینی کلام کا وحی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

البتہ تفسیر جمل اور صاوی میں ہے کہ حضور ﷺ کے تمام اقوال وافعال اور سب احوال وحی الٰہی ہیں، جیسا کہ ہمارے مقررین عام طور پر بیان کرتے ہیں، مگر اس کے بارے میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ وہ ظاہر کے خلاف ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں بلکہ اس آیت کریمہ سے حضور ﷺ کے ہر قول وفعل کا وحی ثابت کرنا ایک وہم ہے، اس لئے کہ **هو** کا مرجع اگر قرآن کو تسلیم کیا جائے تو اس معنی کا خلاف ہونا ظاہر ہے اور اگر **هو** سے مراد حضور کا قول ہو تو ان کے قول سے وہی قول مراد ہے کہ جسے کفار ومشرکین شاعر کا قول کہتے تھے، تو خدائے تعالیٰ نے رد کرتے ہوئے فرمایا: **و لا بقول شاعر**، اور وہ قول قرآن کریم ہی ہے۔ علامہ امام رازی کی اصل عبارت یہ ہے:

> **الظاهر خلاف ما هو المشهور عند بعض المفسرین و هو ان النبی صلی الله علیه و سلم ما کان ینطق الا عن وحی و لا حجة لمن توهم هذا فی الأیة لان قوله تعالٰی: ان هو الا وحی یوحٰی ان کان ضمیر القرآن فظاهر و ان کان ضمیرا عائدا الٰی قوله فالمراد من قوله هو القول الذی کانوا یقولون**

فیه انه قول شاعر و رد الله علیهم فقال: و لا بقول شاعر و ذالك القول هو القرآن۔

اور علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول کو وحی الٰہی مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے اجتہاد سے کچھ نہیں فرمایا اور یہ بھی ظاہر کے خلاف ہے، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائیوں میں اجتہاد فرمایا ہے اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو یا شہد کو جب حضور نے اپنے لئے حرام فرمالیا تو آیت کریمہ نازل ہوئی: یا ایها النبی لم تحرم؟ یعنی اے نبی! تم نے کیوں حرام فرمالیا؟ (پارہ ۲۸ سورہ تحریم) معلوم ہوا کہ اگر حضور کا حرام فرمانا وحی الٰہی ہوتا تو لم تحرم نہ فرمایا جاتا، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کچھ لوگوں کو غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی اجازت دے دی تو آیت کریمہ عفا الله عنك لم اذنت لهم نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا۔ (پ۱۰ ع۱۲) ثابت ہوا کہ حضور کا ہر کلام وحی الٰہی نہیں، ورنہ حضور کے اجازت دینے پر لم اذنت لهم نہ فرمایا جاتا۔ علامہ امام رازی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

هذا یدل علی انه صلی الله علیه و سلم لم یجتهد و هو خلاف الظاهر فانه فی الحروب اجتهد و حرم ما قال الله: لم تحرم و اذن لمن قال الله تعالی: عفا الله عنك لم اذنت لهم۔ (تفسیر کبیر جلد ہفتم ص ۷۰۰)

علاوہ ان کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول وحی الٰہی نہیں ہے، مثلاً بخاری شریف جلد دوم ص ۶۷۴ میں ہے کہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے (کسی مصلحت سے) عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

لا تصل علی احد منهم مات ابدا و لا تقم علی قبره۔ (پ۱۰ع۱۶)

اور کھجوروں کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مشہور ہے:

انتم اعلم بامور دنیاکم۔

اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھارہ دن تک طائف کا محاصرہ جاری رکھا اور وہ فتح نہیں ہوا۔ حضرت نوفل بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضور نے محاصرہ اٹھالیا۔

(زرقانی جلد سوم ص ۳۳)

معلوم ہوا کہ طائف کا محاصرہ وحی الٰہی نہیں تھا، ورنہ صحابی کے کہنے پر حضور محاصرہ ہرگز نہ اٹھاتے۔

ان تمام شواہد سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل وحی الٰہی نہیں ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے کہا کہ ان کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہے تو ان کا مطلب یا تو یہ ہے کہ دینی امور میں حضور کا ہر قول و فعل وحی الٰہی ہے، جیسا کہ معالم التنزیل میں فرمایا اور یا تو ان لوگوں کا قول عام مخصوص منہ البعض ہے۔

هذا ما ظهر لی و العلم بالحق عند الله تعالیٰ و رسوله عز اسمه و صلی الله علیه و سلم۔

کتبه

جلال الدین احمد الامجدی

۱۰ر جمادی الاخریٰ ۱۴۰۲ھ

مسلمان بچے بچیوں میں صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے والی مستند کتاب

اسلامی تعلیم

مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ

از

ابو عبداللہ نقشبندی

تحریک فکر رضا رائیونڈ

مسلمان بچے بچیوں میں صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے والی مستند کتاب

اسلامی تعلیم

مفتی جلال الدین احمد امجدی

تحریک فکر رضا ایوارڈ